واجدہ تبسم

میری کہانی

www.taemeernews.com

ایک بات

"میری کہانی" لکھنے سے قبل میری آنکھوں کے سامنے داغ کا یہ مصرعہ تھا۔
"شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"!

میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا کہ مجھے اپنے حالاتِ زندگی لکھنے چاہئیں یا نہیں؟۔ کیا اس طرح کچھ کھو دینے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔؟ یا کچھ ملتا بھی ہے'؟ کچھ بھی ہو۔ میں نے سوچا۔ "کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی ہے اب"۔ اور جہاں تک "شرکت غم" کا سوال ہے۔! میں نے اپنے دکھڑے اس لئے نہیں روئے ہیں کہ کسی کو اپنے غم میں شریک کروں کیونکہ اب تو غم صرف ماضی بن گیا ہے۔ اور مجھے تو اس غم کی روداد بس یوں سنانی تھی کہ کہ آپ نے میری افسانہ نگاری کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسی لئے میں اپنے یہ مختصر سے حالاتِ زندگی سنا کر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔

واجدہ تبسم

۲۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء۔ حیدرآباد دکن

www.taemeernews.com

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہونگی کہ میری چار برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے؟ کیونکہ جہاں تک محنت کا سوال ہے میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت اور کاوش کا کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ٹلا۔ میں آپ سے بتاؤں اگر میں افسانے نہ لکھتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور اداسیاں جب ایک ایک کرکے لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مرسکوں گی۔ یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مرسکوں گی" جیسے سیدھے سادے جملے میں جتانا چاہ رہی ہوں کہ "اب میں ایسی مانی ہوئی فنکار ہوگئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مرگئی تو کیا ہوا میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا"؟ "جی نہیں" ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی رہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے؟ ویسے جی چاہتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤں کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افسانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تلوار سینے پر لٹک رہی ہے اب گری کہ اب گری۔ یہ چار سال اسی دھک دھکاہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تلوار کب گر جائے اور یوں قصہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے

www.taemeernews.com

کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی۔ مگر سخت جان ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجئے کہ "بھئی واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو۔" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا؟۔ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفان لگایا جا سکا ہے؟۔ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا۔ اور میں نے مان بھی لیا۔ لیکن اس ایک لفظ بزدل کے پیچھے جو ایک لمبی چوڑی داستان چھپی ہے اسے سُنکر آپ کیا فیصلہ کریں گے؟۔

ان چار سالوں میں کئی کئی بار مجھ سے میرے حالاتِ زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری افسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ ٹوٹا تی گئی، سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کہتی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کریں گے کہ حق پر کون تھا۔ لیکن اب جب کہ اپنے حالات زندگی اور افسانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھی ہوں تو بُری طرح ہنسی آ رہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالاتِ زندگی! اور پھر افسانہ نگاری؟ حالات زندگی ہی تو کمبخت ایسے تھے جنھوں نے افسانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راز بھی کھول دینے پڑیں گے جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں۔ آنسو بن کر آنکھوں میں مچلتے رہے ہیں۔ اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حساب لے کر ہی رہیں گے ـــــ!

اپنی چھاچھ کو کوئی گوالن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم نقاد ہوں جو کبھی جانبداری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سامنے یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا سازگار تھا؟ اگر میں یہ جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھاویں گی پھر میں سچائی سے کام کیوں نہ لوں۔

میرا گھرانا سیدوں کا وہ گھرانا تھا۔ (جی ہاں صیغۂ ماضی کیونکہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ"

 www.taemeernews.com

ہو کر بزرگوں کی ناک کٹا ڈالی ہے) جہاں پردے کی سخت قیدو بند تھی اور لڑکیوں کی کسی قسم کی آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ حد یہ ہے کہ میرے بابا نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں" تین سال کی عمر میں جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر چچا نے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں داخلہ ملا گیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اس طرح تو ہماری نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتے) اور وہ حسب ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بہنوں میں جو بہن تیسرے نمبر پہ تھی وہ بڑی ذہین اور ذرا خود سر قسم کی تھی۔ اُسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اسے نہ آتی تھی۔ مگر قصّے کہانیاں پڑھنے کا اسے وہ شوق تھا کہ پوچھئے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔

ان دنوں ہمارے ہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔ 'شمع' سے لیکر 'بچالستان' 'آریہ ورت' اور 'کامیاب' تک۔ اور اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لیکر یے تک چاٹ جایا کرتی۔ جنوں یہیں پر ختم نہیں تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا تھا وہ میرے لئے سب سے بڑی دلچسپی تھے۔ میں وہ سارے کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہا کرتا ساری دنیا کا علم گھول کر پی جاؤں۔ جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں اب یعنی ایم اے ہو کر بگھار سکتی ہوں۔؟ ان دنوں میں چوتھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصور

www.taemeernews.com

اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہنے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تمنا رکھتی تھی۔ چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آرہی ہوں۔ ابھی میں نے آپ کو اپنے "حالات" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کو، یعنی حالات زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں والی کتابیں خرید لاؤں مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا؟ دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی کتنی ہی تمنا کریں ہاتھ نہیں آسکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ (کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ ببا شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ۔ مگر میں بچپن سے سنتی آرہی ہوں کہ انہوں نے لاکھوں سے روپیہ کمایا۔ کمایا بھی اور گنوایا بھی۔ اور جب مرے ہیں اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ امی کی بات نہ پوچھئے وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جہیز میں ڈھیروں سونے کے علاوہ پانچ گاؤں ساتھ لائی تھیں۔ نانی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ "اگر میں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا ہوتا تو میری چاروں نواسیاں اور بہوئیں سونے میں پیلی رہتیں" (ہم آٹھ بہن بھائی ہیں) مگر نانی اماں نے تو ایک ماشے کا تار بھی اٹھا کر نہ رکھا۔ یہ گھپلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر آج تو ہر ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے پہلے میری امی مریں۔ (اس وقت میں ایک سال کی تھی) اس کے دو سال بعد میرے ببا بھی چل دیئے (اچھے لوگ تھے بے چارے، جو ہر فکر سے آزاد ہو گئے) میں نے آپ سے ابھی بتایا ہے نا کہ میرے ببا بہت فضول خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی۔ امی کا جہیز بھی گنوایا۔ قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا

www.taemeernews.com

کہ ساری دولت چپ چپاتے غائب ہوگئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت کا کیا حشر ہو جاتا جو برسوں سے "خاندانِ سادات" کے سر پر تاج بن کر جگمگاتی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ ابّا مرے تو کفن بھی دوسروں نے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی تو ظاہر ہے سب رشتے دار سناٹے میں آگئے اور ایک ایک کر کے کھسکنے لگے (رشتہ دار ناک بھوں نہ چڑھائیں میں تو صرف اپنی کہانی سنا رہی ہوں) جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے جنہیں سوائے نانی اماں کے اور کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔

نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں روپیوں پر چلتی تھیں (یہ مبالغہ نہیں، افسانوی تراش نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلیوں میں بے حساب روپے ہوتے اور انہیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے ٹھونس دیا جاتا۔ اب وہی نانی اماں رہے سہے زیورات کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم و تربیت کر رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینوں کا پیسہ بھی آجاتا تھا اور یوں زندگی گزر رہی تھی بڑی بے رنگی اور بے دلی سے۔ عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے تھے۔ اور اپنے اپنے بستے لٹکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے تو لال گرجا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر ہری بھری بیل جھومتی تھی جس میں سرخ رنگ کے پھولوں کے بے حساب گچھے لٹک رہے ہوتے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دو رویہ قطار دور تک چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین ہمارے وہاں سے گزرنے کے ٹائم تین چار بچے، ہنستے، اچھلتے پردے جھلاتے ڈرائنگ روم سے باہر آتے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی آیا۔ ساروں کے بستے سمیٹے، فرنٹ سیٹ میں بیٹھ جاتی اور

www.taemeernews.com

کار زُوں زُوں کرتی یہ جا وہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑتی اور وہ خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا۔ اور سیمنٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر پہ کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی بھر خوشی کے لئے روتا رہا"

تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ صورتِ حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناطقہ بند تھا کبھی نہ کبھی ایک آدھ بہن بھائی اڑ جاتا۔

"میں تو انڈا کھاؤں گا"

"اوں اوں ـــــ میں تو گھی شکر کھاؤں گی"

نانی اماں کہتیں۔ "گھی شکر؟ یہ کون بڑی بات ہے! مگر بچّو میں تو گھی شکر چوہے سے مانگ کر لایا کرتی ہوں۔ اور اس چوہے کو بچے بہت ناپسند ہیں۔ بس تم اوپر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو" ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سچ مچ رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھایا ہوتا تو اصلیت بھانپ جاتا۔ مگر ہم تو سچ مچ ہی بچّے تھے پتہ نہیں کیسے۔ بہت دنوں بعد، ایک دن یہ بھید کھل گیا کہ وہ چوہے ماموں بے حد فراڈ تھے کمبخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ پتہ نہیں کتنا پانی اور شکر ہم گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی۔!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انہوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ "اچھی بیٹیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں" اور یوں بھی ان کی تنبیہہ جاری ہی رہتی تھی کہ الا بلا نہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ منا ہی ابھی ظلم نہ بنی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

www.taemeernews.com

ہماری ماما غائب ہوگئی۔ کھانا پکانے کی سخت مشکل جا رہی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا کرتیں کہ " ایک ماما لا دو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں؟"۔

ماما ئیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجکٹ کر دی جاتیں۔ ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں بیٹھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرتے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں۔ اور میں شطرنجی پر سر نیہوڑائے، پنسل منہ میں دبائے بہت انہماک سے بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ایک ماما کو باہر سے بھجوایا۔ نانی اماں حسب معمول جرح میں مشغول ہوگئیں۔ میں نے یونہی ایک بار سر اٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے اِدھر اُدھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔

" تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے"

" مرد تو چار سال ہوئے مر گیا"

میں نے لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا۔ کاپی بند کی، پنسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آکر بڑے معتبر انداز میں بولی۔

"کیوں جی! تمہارا مرد تو مر گیا، پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟"۔ (میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا کہ نانی اماں اکدم بھونچک رہ گئیں۔ پہلے تو انھوں نے دیدے ٹپ ٹپا کر اپنے نواسوں کو دیکھا پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا " اور پڑھنے دو اسے رسالے"

www.taemeernews.com

میں اکدم چکرا گئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پر غور کیا تو کوئی برائی اس میں نظر نہ آئی۔ میں ابھی سراسیمہ سی کھڑی تھی کہ نانی اماں گرجیں۔

"آج سے تیرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں"!

میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں بھائیوں سے الجھنے لگیں۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سائڈ میں رہتے تھے۔ اگر کبھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے۔ "نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکئے بہت ذہین ہے۔ آگے چل کر یہ خود بھی کہانیاں لکھے گی" اب نانی اماں انھیں کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر کیا ہوگا۔؟ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے۔ مگر میں رات گئے تک بستر میں ساکت و صامت لیٹی رہی۔ میری سمجھ میں پھر بھی نہ آسکا کہ میں نے ایک جملہ میں کون سا گناہ کر ڈالا تھا۔؟ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے (بچپن میں ہم کس قدر بیباک ہوتے ہیں!)

اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہو گئے۔ اور میری خوشیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا ـــــ پڑھنا ـــــ بس پڑھنا ـــــ اب یوں ہونے لگا کہ جہاں میں نظروں سے ذرا اوجھل ہوئی نانی اماں نے پکارنا شروع کیا۔

"وہ بدذات کدھر ہے؟ کہاں غائب ہو گئی؟"

میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا نا کہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ پھول دفن ہے جو بھری بہار میں مرجھا گیا"

میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں جس بات کو آپ بھول کر بھی مائنڈ نہ کریں، میں اسی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی فطرت اور عادت

www.taemeernews.com

ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلایا ہے مگر پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ پہلو پسند ہے۔ میں جیتی ہی اس کے سہارے ہوں (ایک دن میں یونہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ قصور میرا تھا بھی نہیں۔ وہ میرے پیر تلے آگئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پیر ہٹایا تو وہاں مری ہوئی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک ملول رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا دانہ بھی تو تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا۔؟)

اب مجھے اپنے سائے سے بھی ڈر ڈر کر چلنا پڑتا تھا۔ میں جہاں بھی تنہائی پاتی فوراً اُدھر کا رُخ کر لیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تین منزلہ۔ اِدھر اُدھر بڑے بڑے آنگن، برآمدے، دھابے؟ کافی جگہیں ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑھ سکتی۔ مگر اس دن کے بعد مجھے بہت کم موقعے ملتے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتی۔ میرے ایک بھائی تھے سگریٹ کے شوقین۔ ان کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ نانی اماں کے ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرتے کہ خود کو رضائی میں بالکل چھپا لیتے اور اندر مزے سے سگریٹ دھونکتے رہتے۔ (ان کی اس چوری کا راز یوں کھلا تھا کہ مہربان نے ایک نئی رضائی جلا ڈالی تھی۔) ایک دن میں نے غور سے انھیں دیکھا اور خود بھی اس ترکیب پر عمل کرنے لگی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ اس طرح سر سے پیر تک خود کو ڈھانک لینے سے ایک تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسرے "کمرے" میں اندھیرا بہت ہو جاتا تھا۔ اور الفاظ نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لیے ٹارچ کا انتظام کیا تھا۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ رضائی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی ہٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جانے لگی تو ـــــ انجام ظاہر ہے۔ مگر ایسی ویسی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توہین تھی۔ میرا ذہن

www.taemeernews.com

نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں دیکھ ڈالیں اور بس معاملہ ختم۔ مگر میں گھر والوں پر یوں پوز کرتی تھی کہ جیسے میں بڑی بکش (BOOKish) بڑی ہی پڑھاکو ہوں۔ جب دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا) میں کرتی یہ تھی کہ کور میں کتابوں یا کاپیوں میں اندر ناول اور رسالے رکھ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں، مگر میں تو دوسرے ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں سے بہت سے یقیں کریں بھی ناں) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی ناول پڑھا کرتی۔ بد بختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک رسالہ کاپی میں چھپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں نے یونہی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی تھی۔ اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑی اور رسالہ نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان بھیا نے یہ واردات نانی اماں سے جا بتائی۔ نانی اماں نے اتنا مارا کہ میرا بے ہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام۔!!

میں ان دنوں زندگی سے سخت بد دل ہو رہی تھی۔ انہی دنوں مجھ پر ٹائیفائڈ کا شدید حملہ ہوا۔

میرے ببا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک پر بھی نکل جاتے تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا۔ بال لمبے لمبے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں

www.taemeernews.com

کہ آنکھوں کا اجالا گالوں پر پڑتا تھا۔ میں نے اپنی امی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں بس کہانی کی خیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ جیسے کچھ بھی تھے، مگر شاید میری بدنصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں معمولی میں تھی۔ اور مزید ستم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آرہی تھی۔ تندرست اور نک سک سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں بھی تھی جس کا رنگ سانولا تھا، جسم دبلا پتلا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال اور بجھی بجھی آنکھیں، قد کی مناسبت سے بال بہت لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیل یا کالی بلّی کہہ کہہ کر ستایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عمروں سے محبت نہ پاکر میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کتابوں کو بنایا تھا۔ (یہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہیئے تھی) بیماری جھیل کر اٹھی تو اور زیادہ چڑچڑی اور زود رنج ہو گئی۔ احساس دگنا ہو گیا۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ میں آپ سے بتاؤں، ان دنوں کتابوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی۔

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ میں جی لگایا۔ اس طرح لامحالہ میں کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیاں بہت خوش رہتیں۔ میں نے اپنی ذہانت سے ایک ناجائز فائدہ یہ اٹھایا کہ مس سے یہ پرمیشن حاصل کر لی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری ریڈنگ ہمیشہ سے بے حد فاسٹ ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ مس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی۔ معصوم مسرت۔!

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے۔ غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کے کیسے کیسے جواز ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درد کی شکایت

www.taemeernews.com

تو نانی اماں نے جھٹ کہہ دیا۔

"پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے"

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے میرے چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں تاکہ خوب پڑھ سکوں۔ سیمنٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار چکر کھاتی نکلتی تو دل کو پختہ یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انھیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ یہ تک یاد نہیں کہ کسے موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی۔

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوند دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر حیدر آباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ستم کچھ اور بھی سوا ہو گئے۔

اب ہم بہنوں نے مڈل اسکول پاس کر لیا تھا۔ بھیا لوگ کالجوں کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھرواں جوڑا تھا۔ ۶۰ تولے کا۔ ساٹھ تولے کی کوئی حقیقت نہیں۔ نانی اماں نے جب بھی ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی مجھے یاد ہے ہر بار جب سر و تہ لیکر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کرتی تھیں تو ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں۔ کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زیور بھی نہ تھا جس کو توڑ تاڑ کر اخراجات

www.taemeernews.com

پورے کئے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زمینات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمینداری سسٹم لاگو ہوا تو وہ زمینات بھی حکومت کے بینک میں چلی گئیں — !

(سنتے ہیں زیور سنگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زیور تو سدا رہن رکھنے یا توڑنے کے کام ہی آیا — !)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امراوتی سے حیدرآباد دکن کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے۔ میں کس قدر بوڑھی ہوں اس کا احساس سوائے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے؟ حیدرآباد آکر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گذارتے آرہے تھے — ! مصیبتیں کیا ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ یہاں آکر چلا۔ ہمارے پاس کھانے کو اناج نہ تھا پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ رہنے کو مکان نہ تھا۔ پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتابیں خریدنے کو پیسے نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیئے جاتے۔ ان دنوں میں نویں کلاس میں تھی کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بدنصیب۔ ! !

حیدرآباد آکر سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم ہو کر رہ گیا۔ لائبریری میں اس قدر اچھی اچھی کتابیں تھیں ! !

اے ندو توصدا بنیت وسے۔

وہیں کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی آنکھوں لمبے بالوں، سانولی رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بھر میں وہ 'بنگالی مینا' کے نام سے مشہور تھی۔ آشنائیاں

پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔ قریبی سہیلیاں اسے "بلبل" یا "کوئل" کہہ کر پکارتیں۔

وہ خوش آواز پرندہ میں تھی۔! میں نے اوروں سے اپنے بارے میں بہت سنا تھا لیکن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی پر بیٹھی بے دلی سے کچھ گن گنا رہی تھی۔ میرے بازو والے ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گن گناتا سن اس نے کتاب بند کر دی اور کہا۔

"واجدہ ذرا زور سے تو بھی گاؤ۔"

میری نگاہ کتاب سے جا ٹکرائی۔ وہ منشی پریم چندر کا ناول "گئودان" تھا۔ میں نے ذرا جھجک کر کہا

"ایک شرط پر۔"

"کون سی شرط؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"میں تمھیں گانا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب پڑھنے کو دو گی۔"

شرط ایسی کوئی کڑی نہ لگی اسے۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سنایا۔

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل۔

— تسکین کو ہم نہ روئیں جو..... کتاب میرے ہاتھوں میں تھی۔!

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا۔ کیونکہ اس طرح گانا سنا دینے سے میرا کچھ نہ بگڑتا تھا مگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں۔ پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا پٹنے لگا۔ جتنی کتابیں میں نے ان دنوں پڑھیں ان کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ دنیا اتنی وسیع ہے؟ کتنے ہی رائٹر گذر رہے ہیں۔ جنھوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے؟ میں نے کیا پڑھا؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر

www.taemeernews.com

اپنے نامساعد حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اس پر فخر کرتی ہوں۔ (حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اٹھایا ہے۔)

پھر پولیس ایکشن ہوا۔ پھر سے شہر میں بھگدڑ مچی۔ ایک بھیا پاکستان چل دیئے، ایک آگے ہی وطن میں تعلیم پوری کرنے چلے گئے تھے۔ نہ دماغی چین تھا، نہ جسمانی آرام۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

"کیا میں یونہی جاہل رہ جاؤں گی؟" یہ سوال رہ رہ کے میرے مجروح دل اور دماغ کو کچوکے دیتا۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن ہی سے اتنا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گڑیاں اور ہنڈکلیا کھیلا کرتیں میں محلے کے بچوں کو لے کر اسکول لگایا کرتی۔ پھر اللہ میاں کا یہ ستم کیسا تھا۔؟ نانی اماں سمجھاتیں۔

"بیٹا تم لوگ سید ہو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو انھیں پیارے ہوتے ہیں۔"

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنجوقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر یوں محسوس ہوا گویا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔

"دیکھ لیا نا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور پر سر جھکائے جاتے ہیں۔"

نانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خدا کو برا کہا انہوں نے کان پکڑوا کر توبہ کروائی اور ہمارے گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو "ناانصاف" کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

"بس فیس" میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آنی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر۔ چلئے قصہ ختم۔ میٹرک، پھر ایف اے

www.taemeernews.com

پھر بی۔ اے اور اب ایم اے سب پرائیویٹ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ کبھی ایک مہینے تک کے لئے کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا دل سے پڑھا۔ امتحان دیا۔ پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔

ایف۔ اے کا امتحان جیسے دیا۔ دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتابیں تھیں۔ نہ کھانے کو تھا ان دنوں راشن سے چنے اور پکی ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے۔ ہم جیسے کہاں سے لاتے؟ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کتابیں بھی نہ مل سکی تھیں، معاشیات کا پرچہ تھا۔ جو لکھا تھا آج بھی یاد ہے۔ سوشیالوجی کا پرچہ بھی یونہی کیا۔ پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو گالیاں۔ ایک آپا قریب سے گذریں اور سوشیالوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا۔ ہنس کر بولیں۔

"کمیونسٹ ہوگئی ہو؟"

میں جل کر بولی تھی۔ "تن پر کپڑے نہ ہوں، پیٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں ننگا ہوں۔ بھوکا ہوں اور آپ اسے کمیونزم کہتی ہیں تو بے شک میں کمیونسٹ ہوں۔"

نتیجہ آیا۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی۔!

وہ نام نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا۔ میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں تنی ہوئی دکھائی دیں۔ بی۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا۔ "اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے — اکنامکس Main لو تاکہ کچھ قدر بھی رہے۔" بہکاوے میں آگئی۔ جس وقت کو لیکچن پیپر بانٹنے کی بیل بجی اور پروفیسر نے کہا۔

"جس جس کا اکنامکس مین ہو کھڑی ہو جائیں" تو پورے ہال میں صرف

www.taemeernews.com

ایک لڑکی کھڑی تھی وہ بھی ایک پرائیویٹ کینڈیڈیٹ اور وہ میں تھی۔!

یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی۔ پہلی تعلیمی شکست۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات لئے تھے۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔ مگر اس میں کیا میری اپنی ذہانت کا قصور تھا۔ مجھے توڑھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی۔ پڑھنے والے بھلے ہی یقین نہ کریں۔ مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے۔! دوسری بار پھر بی۔ اے میں بیٹھی۔ پھر لڑھکی۔ میرے خدا!" مجھ میں بہت ہمت ہے کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کروں گی اپنی" میں نے اپنے دل کو سنایا۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر صرف ایک جوڑا ہوا کرتا تھا۔ بھائیوں کی قمیص پتلون پہن، میم صاحب بنی، وہ جوڑا دھوتی اور پھر امتحان دینے مزے سے دھلی دھلائی ساڑھی پہن کر جاتی۔ غریبی کے داغ کس نے دیکھے ہیں؟

اچھی طرح یاد ہے صبح پرچہ تھا۔ رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سوئے تھے۔ اچانک وطن سے ایک کزن بھائی آٹپکے۔ یہ بھائی بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ آتے ہی کہا۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لاؤ۔"

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چھت کو دیکھتی پڑی تھی۔ ان کی بات سن کر میں نے چہرہ بھی رضائی میں چھپالیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔ باہر سے آئے تو ہاتھوں میں کیک، پیسٹری اور سالٹی اسنیکس کے پیکٹ تھے۔ میں نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولیں انھیں لدا پھندا دیکھا تو پھر سے سوگئی۔ صبح میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ میرا رنگ سانولا ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد چاند ہو رہا تھا۔

www.taemeernews.com

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا۔ پاس بھی ہوگئی۔ زندگی کی کافی بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی۔ مگر دل کو جیسے گھن لگ گیا۔ زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی۔ مگر افروز (میری چھوٹی بہن میری دوست) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں "لمبے بالوں والی واجدہ" کے نام سے مشہور تھی۔ جھڑ جھڑا کر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی اور وزن دن بدن گھٹنے لگا۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اس نے صاف کہہ دیا۔

"اگر بٹیا کے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک خطرناک گھاٹی میں جاکر ختم ہوتا ہے"۔ نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "مرغی کے چوزوں کا سوپ پلائیے۔ پھل دیجئے۔ دودھ پلائیے۔ اور۔ اور۔ اور۔" اب میں یہ آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانک اور گولیاں لکھ کر دیں غذا کے بعد لوں یا پہلے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کبھی کبھار ہی کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ وہ ٹانک اور گولیاں ردتوں پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں، افروز اور آپی مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے وہ ٹانک اور گولیاں پھینکی ہیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جو اتنے ہی دنوں سے دل کو چھید رہے ہوئے ہیں۔)

اُنہی دنوں دلی سے ایک ویکلی "آئینہ" شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا۔ "میری یادداشت سے" اس کے تحت کوئی ناقابل فراموش واقعہ اپنی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ایک دن یونہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انٹر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی لفظوں میں بیان نہ کر سکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو

www.taemeernews.com

بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے۔ جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں، جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آ رہی ہوں۔ آج ٹھنڈے سائے تلے آ گئی ہوں۔!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دکھ کے علاوہ بھی کئی واقعے اور حادثے ایسے تھے جنھوں نے میرے دل کو کرچی کرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انھیں لفظوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی۔ ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ اکدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ ادبی حلقوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات سنا رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گنا رہی ہوں۔ مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ ماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے تلملاتے بچے، جن کی تعلیم و تربیت، دکھ درد، اچھے برے میں بس نانی اماں ہی تھیں۔ کوئی کسی کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کروں کہ انھوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا؟ ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ۔ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے۔ اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کل کلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور بری صحبت میں پڑ کر ناکارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ "دیکھا!؟ کیسے اولاد کی تربیت کی ہے؟" اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے؟ نانی اماں

www.taemeernews.com

خدا نہ تھیں مگر میں نے انھیں سجدے کیے ہیں، تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ اب اِدھر اُدھر سے جو دو چار میری کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آگیا۔

"واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دیدی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں۔؟"

"اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"

"دیکھنا ایک دن باپ کی ناک کٹوا کر رہے گی۔"

"میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے۔ پہلے تو بات دبی دبی سی رہی۔ پھر زور شور سے میرے خلاف محاذ بننے لگا۔ کسی سلسلے میں نانی اماں وطن گئیں۔ وہاں لوگوں نے خوب کان بھرے۔ واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں۔

انہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچہ لیکر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔ بتا تو کیا لکھتی ہے؟" کہانی آپ کے سامنے ہے، بتائیے بھلا میں یہ کہانی سنا سکتی تھی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس سچی حقیقت کو کہانی کا روپ دیا۔ اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی پھرتی۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہہ ہو گیا۔ بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً "ایسی ویسی" کہانیاں یہ لکھتی ہے تب ہی تو سنا نہیں سکتی۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آموجود ہوئیں۔ "بتا کیا لکھ رہی ہے؟ سنا کیا لکھ رہی ہے؟" نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں مگر انھیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر میرے ہاتھوں میں

www.taemeernews.com

لمبا چوڑا کاغذ ہے یا کاغذوں کا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی۔

"خط اتنے بڑے بڑے لکھے جاتے ہیں؟ ضرور کہانی لکھ رہی ہے۔

اب مصیبت یہ رہی کہ ایڈیٹروں کے جو خط آتے اور جاتے سب کچھ نانی اماں سنسر کرتیں۔

محترمی ایڈیٹر صاحب۔

آپ نے کہانی مانگی ہے۔ اس وقت تو نہیں ہے۔

جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی۔

"کیا لکھا۔ جب لکھوں گی۔! مگر یہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟"

پھر کسی نامراد نکمے۔ بیوقوف ایڈیٹر کا خط آگیا کہ کہانی مل گئی۔ ارے کمبخت مل گئی تو اطلاع دینا کوئی ضرور تھا۔ لیجئے اب نانی اماں سُن رہی ہیں۔

"کہانی مل گئی۔ آپ نے کمال کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب آپ آسمانِ ادب کا سورج بن کر چمکیں گی۔"

"یہ کہانی کب بھجوائی تھی۔؟"

پکڑا محاسبہ۔ بخدا زندگی اجیرن ہو گئی۔ میں نے دل سے، حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔" اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی۔ کون یہ جوکھم مول لے۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے؟"

کئی دن گذر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا۔ ایک دن ایک ماموں تشریف لائے۔ پامسٹری سے بڑا لگاؤ ہے انہیں۔ میرا ہاتھ دیکھا۔ پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے۔ پھر سیریس ہو کر بولے۔

"اری سچ ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔

www.taemeernews.com

اور خوب ساری۔"

میں نے آزردہ ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ماموں میرا دل نہ جلایئے۔ ہاتھ آیا موقع تو کھو گیا۔ اب کون شہرت کا تک ہے۔"

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم بھول گئی اور ایک کہانی فوراً لکھ ڈالی۔ "آگ میں پھول" لفافے میں بند کر کے رکھ بھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر کے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے۔؟" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"وہ جھوٹ کیوں بولتا؟ صاف کہہ گیا۔" ملکو بی بی نے کھت دیئے۔ بولے غُپ چُپ ڈال کر آجا۔"

اس کمبخت "غُپ چُپ" نے وہ آگ لگائی کہ پوچھئے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آنگن میں آگ اور پھول بکھرے نظر آرہے تھے میرے خدا۔

میں سہم کر رہ گئی۔ بزدل لڑکی۔

پھر ایک پھوپھی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔

"اچھا تو اسی کا نام واجدہ تبسم ہے؟"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جانے مجھ میں کیا رایل ہونے کے آثار نظر آئے۔ کہلکہ میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچہ ماں کا زیادہ ہوتا ہے۔ باپ کا کم۔ امی کا بکھا نام چل نکلا۔ بگڑا تو کسی نے ملکہ کہنا شروع کیا۔ کسی نے ملکو اور کسی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلے کی نوبت آئی تو بیا والا نام لکھایا گیا۔ "واجدہ بیگم" مگر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو خود کو واجدہ تبسم بنالیا۔ صاف سیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دیئے۔ میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی،

www.taemeernews.com

اور یہی کیا بھی۔ اس طرح خود میرے خاندان میں بھی پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام، "واجدہ تبسم" ہے۔

باتوں باتوں میں "تین جنازے" کا ذکر آگیا۔ کہنے لگیں "یہ کہانی تم نے ہی لکھی ہے نا؟"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی۔ "جی نہیں وہ تو فکر تونسوی نے لکھی ہے۔"

جس زمانے میں شاہراہ میں وہ کہانی چھپی اسے فکر صاحب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔

گھبراہٹ میں جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پر نام تو تمہارا دیا ہوا ہے۔"

اب کے میں بہت معتبر انداز سے جھوٹ بنانے لگی۔ "دیکھئے نا دراصل ہوتا یوں ہے....." میں نے اس قدر الٹ پلٹ باتیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے بسی پر مجھی کو رونا آگیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اپنی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی تھی۔ دل کا سارا غبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا۔ جاتے جاتے جب وہ سمجھانے لگیں تو یہ بھی کہا۔ "دیکھو بٹیا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو۔"

ابھی وہ کچھ کہتی ہی تھیں کہ اکدم واجدہ زور سے بول پڑی۔ "کٹے گی تو میرے باپ کی ناک کٹے گی، آپ کا کیا بگڑے گا؟ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی اماں اکیلی رہ گئیں تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوجھی۔ اب ہم کسی قابل ہوئے ہیں تو آپ کیوں اپنائیت جتانے آن پہنچی ہیں؟"

وہ یقیناً میں نہ تھی۔ واجدہ تھی۔ جو ایک کہانی لکھنے والی تھی۔ جو اپنے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدل لڑکی ہوں۔ ہاں جناب! اس دن ڈول چھلکا اور ایسا چھلکا کہ پھر کسی نے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے۔

www.taemeernews.com

وہ بھی جو کہنا چاہیے۔ اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہیے۔
(میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے کتنے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکے۔؟)

ایک بار ایسے ہی کسی موقعے پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیز سے کہا تھا۔
"جی آپ تو آپ ہیں۔ اگر قبر سے میرا باپ بھی اٹھ کر آجائے تو بھی میں افسانے لکھنا نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں چار سال پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی۔ اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ واجدہ تبسم! میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے ـــ ہاں ہاں وہ واجدہ نا ـــ میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اس کے باپ تو میرے دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بٹیا نے۔"

آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ ضرور آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے تنک مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہے جو لوگ میرا نام لے لے کر فخر محسوس کرتے ہیں ان سے کہہ دوں
"معاف کیجئے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ مگر پھر بھی نانی اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگمان ضرور ہیں۔ انھیں ایک شکایت یہ ہے کہ میں انھیں اپنی کہانیاں نہیں سناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ ہے بھئی اپنا بوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سنا سکیں۔ ایک بار، بار بار کے کہنے پر، افروز نانی اماں کو

www.taemeernews.com

میری کہانی سنانے بیٹھی ۔ اس میں لفظ محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گڑ بڑا گئیں ۔

" ہیں ۔ کیا پڑھا ؟ محبت ۔۔ کس کو محبت ۔۔ کس سے ۔ ؟ ! اچھا تو یہ بات ہے ۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ۔ ہوں تو یوں کہو "

اسی لئے میں کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں ۔ ایک بے حد نازک اور اندھیارے کونے میں ۔ اگر آنگن سے ہو کر کوئی اس کمرے میں آئے تو دکھائی بھی نہیں دے سکتا کہ کونے میں کوئی متنفس بھی ہے ۔ بانو (جیلانی بانو) جب پہلی پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اس نے وہ جگہ دیکھنی چاہی ، جہاں بیٹھ کر میں " ادب تخلیق " کیا کرتی تھی ۔ پہلے تو اُسے یقین ہی نہ آیا کہ ایسی واہیات جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے ۔ مگر جب میں نے اسے ٹوٹا ہوا پین ، زنگ آلود چاقو ، چھوٹی سی دوات لال آدھی پنسل کا ٹکڑا اور تازے آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرش پر بے شمار سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اسے یقین کرنا پڑا ۔ گھر جا کر اس نے لکھا تھا ۔

" دجو چندا ۔
میرا مشورہ ہے کہ تم اس کونے سے نکل کر آسمان تلے آجاؤ
اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آجائے تو
کیا کہنے ؟ "

میں نے اس سے کہا تھا ۔

" میں کسی سورج کی مرہون منت نہیں ہونا چاہتی ۔ میں خود سورج بنکر اس کونے کو منور کر دوں گی " ۔ سورج بن جانے کی یہ تمنا میرے دل

www.taemeernews.com

میں آج بھی موجود ہے۔ بانو کے علاوہ اور بھی بہتوں نے مجھ سے یہ بات کہی ہے، میں صرف گھریلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ میری کہانیوں میں کوئی خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا میں اور بھی تو موضوع ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مجھے عورتوں کا ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں جن میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمیٹا گیا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال۔ یہاں کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کرنے والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں لکھنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو، کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کمیونزم یا کسی اور ازم کا پروپیگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہوگی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے۔ جب تک کہ آپ نے شئے متعلقہ سے گہری واقفیت نہ حاصل کر لی ہو۔ اگر میں یہاں حیدرآباد دکن میں بیٹھ کر کراچی کے غنڈوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی بھونڈی بات ہوگی۔ میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرنا چاہتی، صرف اپنے متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر "مہالکشمی کا پل" ایسی کہانی بڑی خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہ صرف بمبئی دیکھی ہے، بلکہ وہ مرد ہے اور اس نے باہر کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہوگی۔ کوئی بات ایسی نہ ہوگی جس کے متعلق کہا جا سکے کہ "مسٹر آپ نے کبھی بمبئی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگاتے ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں۔؟" برخلاف اس کے اگر آپ کرشن سے پوچھیں کہ "بریانی میں کتنی شرخ

www.taemeernews.com

مرچیں ڈالتے ہیں۔؟" اور وہ یہ جواب دیں کہ "سیر بھر کی بریانی میں آدھ پاؤ مرچیں" تو یہاں ان کے "مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریانی میں مرچ تو پڑتی ہی نہیں۔ کرشن بریانی نہیں پکا سکتا۔ میں مہالکشمی کے پل پر کوئی کہانی نہیں کھڑی کر سکتی۔ کیونکہ ہم دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور پڑھنے والوں سے بھی، یوں بے ایمانی کر کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے دل کو یہ ڈبکا بھی نہیں لگا رہتا کہ کہیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہیں۔؟

لوگ مجھ سے کہتے ہیں۔ "تم کب تک گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہو گی۔؟ باہر نکلو، دنیا میں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آجا کے وہی ایک سی باتیں ہیں۔" چلئے مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر ذرا یہ بھی سنئے ـــ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم میں، ریل میں پہلی بار، صرف تین سال پہلے بیٹھی ہوں؟ پارٹیشن کے وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم حیدرآباد تک آ پہنچے، مگر جہاں تک ہوش و حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے۔ یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئیگا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ وہ لڑکی، جو خود کو 'بڑھیا' کہتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں بیٹھی ہو۔ وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے۔؟ کیا لکھ سکتی ہے۔ شاید ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ، مگر بھیا کی شادی ناگپور میں ٹھیری۔ برات لیکر تو جانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے اندازے لگا رکھے تھے۔ لیکن جب دیکھا تو سخت

www.taemeernews.com

مایوسی ہوئی ۔" ارے باس اسی واہیات سی چیز کے لئے ڈھونڈ رہے تھے؟ پلیٹ فارم الیا اور پلیٹ فارم دلیا۔ خاک بھی گلیمر نہ تھا کمبخت میں!" اب ریل میں بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جا رہا ہے۔ کیونکہ ریل پل پر سے گذر رہی ہے گھڑ گھڑ دھڑ دھڑ کی دحشت ناک آوازیں! اور مجھے ہر لمحہ یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔ قریب بیٹھا ہوا ایک کرسچین جھلا کر بولا۔

"OGosh! The most coward creture give everseen!"

("اوگاش ــــ دی موسٹ کاورڈ کریچر آہیوا یورسین!")

جس لڑکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ ریمارک پاس کرتا ہے، اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے۔؟ نا بابا نا۔ یہ ہم سے نہ ہوگا۔ ایسا کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب لکھیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن تھا۔ تب تو نہ مرے، اب کیا مریں گے۔؟ اب تو جینے کے دن آ رہے ہیں۔

ویسے آپ یقین مانئے آپ میں سے کوئی میری کہانیوں کو برا کہتا ہے تو مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری کہانیوں کو برا کہا ہے۔!) اگر آپ اچھا کہہ دیتے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میں نے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے انھوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا ہے۔ ایسے میں میں اس دکھ اور کرب کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے میں مجھے پیش آیا تھا۔؟ (میں نے آپ سے کہا ہے ناکہ

www.taemeernews.com

مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں بھی ایک ہی sitting میں لکھی ہیں۔) "شہر ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی۔ میرا دل کیسے کیسے روتا تھا۔؟ پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا کہ "ایسی کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی" مگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون رلانے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک" ہے)۔

"کالے بادل" لکھنے سے میں جس کرب اور امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیر شے ہے۔ مگر پھر بھی اس کو سجدے کئے جاتے ہیں۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا۔ اور خود ہی اس کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے۔ ہم کون ہیں۔؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں Pagal ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی تو۔؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بار خدا بن جانے کے بارے میں سوچتا ضرور ہو گا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی اچھی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ چوتھے ہی دن آسمان سے اتر آتی اور سیدھی سادی واجدہ، واجدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی جملہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

جینا ہی پڑتا ہے۔ مرنا ہی پڑتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں تو یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے کہانی لکھنے میں محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔ ہاں شدید کرب سے اکثر گذرنا پڑتا ہے۔ "شہر ممنوع"۔ "گلستان سے قبرستان تک"۔ "ساتواں شہزادہ"۔ "کالے بادل"۔ "پاندان"۔ "گناہوں کی داداش"۔ "آگ میں پھول" یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں، کہانیاں نہیں جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔

ابھی چار سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ ۲۶ ستمبر ۵۵ء کو میری پہلی کہانی چھپی تھی۔ اور اب چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں داد بہت ملی۔ "بے داد" کچھ نہیں۔ خودستائی نہیں کر رہی ہوں۔ لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ بھی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں۔ لیکن سوچتی ہوں کہ ناکامی کی اینٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنائیاں اور مصیبتیں جھیل کر بڑھے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے اور یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی ہار نہیں مان سکتی۔

رہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہئے تو میں آپ سے بتاؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی تمنا تو میری بہت پرانی تمنا ہے۔ میری یہ تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک چڑیا نے اڑنا سیکھا ہے۔ اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بیچارا تھک کر زمین پر نہ آ پڑے گا۔؟

www.taemeernews.com

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ " عجیب ہے یہ لڑکی بھی ۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلوانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا "

جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی فارمل ہوتا ہے ۔ ہمارے ادب میں ' پیش لفظ ' کی وبا بہت عام رہی ہے مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑ رہی ہے ۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنی نہج سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے ۔ اور یوں قاری کی بات جانے بھی دیجئے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی ناپسند ہے ۔ بھئی آخر کیا ضرور ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی " بڑے آدمی " کے نام کا لیبل بھی ضرور لگا ہو ۔ میں نے تو ان " رایوں " کو کبھی روا نہیں رکھا ہے جو ڈسٹ کور پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چپکا دی جاتی ہیں ۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کئی " بڑے لوگوں " کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں ۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر جھوٹوں بھی " کچھ " لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے پیش لفظ دراصل پڑھنے والوں کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے ، اور مجھے چیپ قسم کی پبلسٹی سے ہمیشہ سے بڑی نفرت رہی ہے ۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے ۔ کسی کی کار میں بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود ہی اپنی منزل کو پہنچوں !!

والسلام
نسیم

۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء حیدرآباد ۔ دکن ۔